نگارشات

(۱) تاریخِ مظالم نجد کا ایک خونچکاں ورق

نجدیوں کی اسلام سے دیرینہ عداوت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

گذشتہ چند سال کے واقعات نے مسلمانوں کے دل میں کچھ ایسے جذبات ودیعت کر دئے ہیں کہ ادھر ''نجد'' کا نام لیا گیا اور سینہ کے اندر خاص تلاطم انگیز تاثرات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ شوال کا مہینہ جس میں مظالم نجد کا دور اپنے سال کو ختم کر کے نئے سال میں قدم رکھتا ہے با حمیت ارباب ایمان کے لئے ایک پیغام مصیبت بن کر آتا ہے اور محرم کا پیش خیمہ قرار پاجاتا ہے جس میں ایک مرتبہ بے دست و پا مصیبت زدہ اپنی ناکامیوں پر بیٹھ کر چند آنسو بہا لیتے ہیں۔ یوں تو نجد کے کارنامہ عمل سے کس کا دل ہے جو مجروح نہ ہوا اور کون ہے جو ان تاثرات کا گھائل ہوتے ہوئے ان سے ناواقف ہو؟ لیکن تاریخی تتبع سے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے وہ ایک حد تک پردہ میں ہیں اور اگر دنیائے کتب کی سیر کی جائے تو اس سرزمین کے ماضی پر ایک عبرت خیز اطلاع حاصل ہوتی ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ افراد بشر کی طبائع و اخلاق میں کسی زمین کی آب و ہوا تاثیر نہیں کرتی لیکن تجربہ شاہد ہے کہ خیر و شر اور ایمان و کفر یا عدل و ظلم میں بھی زمینوں کی تاثیر کافی حصہ رکھتی ہے۔ جس طرح معادن میں کوئی خاک اپنے آغوش میں یاقوت و زمرد کی تربیت کرتی ہے اور کسی گوشہ میں سوائے بے آب پتھروں اور سنگریزوں کے کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اسی طرح افراد بشر میں زمین کا اختلاف بڑے تغیرات کو رونما کر دیتا ہے اور شاید للناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ میں اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ مضمر ہو۔

اس وقت ہم نے قصد کیا ہے کہ نجد کی قدیم تاریخ پر نظر کرتے ہوئے ان فتنہ خیز واقعات کی ایک مختصر فہرست لکھیں جو اس خطۂ زمین سے رونما ہوئے اور اس کے ضمن میں اسلام کے ساتھ نجدیوں کی دیرینہ عداوت کا پورے طور پر انکشاف ہوگا۔

نجد کا جغرافیہ اور رسولؐ کا ارشاد

نجد کے معنی لغت میں بلند حصۂ زمین کے ہیں اور چونکہ حجاز اپنے شرق و غرب میں دو قسم کی متخالف زمینوں میں گھرا ہوا ہے، ایک بہت زیادہ نشیب اور دوسری ایک حد تک بلند اس لئے اول الذکر حصہ زمین کا نام تہامہ اور دوسرے کا نام نجد ہوا اور حجاز ان دونوں کے درمیانی حصہ کا نام ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام حجاز ہوا کہ وہ تہامہ و نجد کے درمیان حاجز یعنی حائل ہے۔ نجد اپنے حدود کی حیثیت سے پانچ ملکوں میں گھرا ہوا ہے۔ تہامہ، یمن، عراق، شام، حجاز اور یہ حجاز کے شرقی جانب میں واقع ہے چنانچہ علامہ ابن آلوسی بغدادی نے 'تاریخ نجد' میں لکھا ہے کہ

نجد قطعة عظيمة من جزيرة العرب تحد شمالا ببرالشام شرقاً بعراق العرب والاحسئا وجنوباً بالا حقاف واليمامة وغرباً بالحجاز۔

نجد میں ایک بہت بڑا حصہ زمین کا ہے جس کے شمالی حدود میں سرزمین شام اور شرقی پہلو میں عراق عرب و احسئا اور جنوب میں احقاف و یمامہ اور مغربی سمت حجاز ہے۔

اگر چہ یمامہ کو نجد کے چوحدی میں ذکر کرنا غلطی سے خالی نہیں

کیونکہ یمامہ خود نجد میں ہے جیسا کہ ہم آئندہ ثابت کردیں گے لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ جب نجد کے مغربی سمت حجاز ہے تو اگر حجاز کی جانب سے نظر کی جائے نجد اس کے مشرق میں واقع ہوگا۔

قاموس الامکنۃ والبقاع میں اس کی تصریح کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ **بلاد نجد ھی الواقعۃ شرقی بلاد الحجاز** ۔ یعنی بلاد نجد وہ ہیں جو حجاز کے مشرقی جانب میں واقع ہیں اور اس کے بعد ان اخبار کے مفہوم سے بالکل پردہ ہٹ جاتا ہے جن میں مشرق کے متعلق طرح طرح کی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ **غلظ القلوب والجفآء فی المشرق** (صحیح مسلم) **الفتنۃ ھُھُنا من حیث یطلع قرن الشمس** (صحیح بخاری) **یخرج ناس من قبل المشرق یقرأون القرآن لا یجاوز تراقبھم یمرقون من الذین کما یمرق السھم من الرمیۃ**۔

(خلاصۃ الکلام سید زینی دحلان شافعی مفتی مکہ معظمہ)

سخت دلی اور ظلم وستم مشرق میں ہے، فتنہ یہیں سے اٹھے گا جدھر سے آفتاب کی روشنی پھیلتی ہے۔ مشرق سے ایک گروہ ایسا ظاہر ہوگا جو قرآن تو پڑھتا ہوگا لیکن اس کے گلے کے نیچے نہیں اترتا ہوگا، وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح کمان سے تیر نکلتا ہے، اور بعض اخبار میں نام لے کر اس ابہام کو دور کردیا گیا ہے اور جب صحابہ نے نجد کے لئے دعا کی خواہش کی تو حضرت نے فرمایا:

ھناك الز لازل والفتن وبھا یطلع قرن الشیطان وہاں زلزلہ وفتنہ برانگیختہ ہوں گے اور وہیں سے شیطان کا غلبہ ہوگا (صحیح بخاری) چنانچہ تاریخیں گذشتہ واقعات کو محفوظ کیے ہوئے رسولؐ کے قول کی تصدیق کررہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ نجد ہمیشہ فتنہ وفساد کا گہوارہ بنا رہا۔

نجد کے قدیم باشندے اسلام کے چند سو سال پہلے نجد قبیلہ طسم وجدیس کے امراؤ ملوک کا مسکن رہا کیا اور یمامہ میں جو نجد کا صدر مقام ہے ان کا پایہ تخت تھا اس دوران میں عارضی طور پر بنی ہمدان بن حمیر نے بھی قبضہ کرلیا لیکن بعد کو پھر طسم وجدیس نے غلبہ حاصل کرلیا اور یمامہ پر قابض ہوگئے۔

طسم وجدید عاد وثمود کی طرح قبائل بائدہ میں سے ہیں، آخری زمانہ میں جنگ وجدال ومعاصی الٓہیہ نے ان کی تباہی کے اسباب مہیا کئے اور بالآخر صفحۂ وجود سے حرف غلط کی طرح محو کردئے گئے جدیس کے بعض سلاطین کا شرمناک طرزعمل تاریخی اوراق میں محفوظ ہے کہ اس کا حکم تھا جو شادی ہو عروس شب اول ان کے یہاں لائی جائے۔ آخر ایک غیرت مند لڑکی نے اپنی شادی کے دوسرے روز کوچہ وبازار میں اپنے قوم وقبیلہ کو اشعار کے ذریعہ سے غیرت دلائی۔

لا احد اذل من جدیس
اھٰکذا یفعل بالعروس

یہی اشعار تھے جس کا نتیجہ انقلاب سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ واقعات تاریخ ابن خلدون میں تفصیل سے موجود ہیں، طسم وجدیس کے بعد نجد میں بنی حنیفہ کا غلبہ ہوا جن کے بعد بعض تفاصیل آئندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے۔

صدر اسلام میں نجدیوں کا وحشتناک سلوک

رسالتمآبؐ جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے اور آپ کی نبوت ورسالت کا شہرہ دور دور پہنچنے لگا تو نجد کے رہنے والوں میں سے ایک شخص ابوالبراء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنہ حضرت کی خدمت میں آیا اور اظہار اسلام کے بعد عرض کی کہ اگر آپ اپنے اصحاب میں سے کچھ اشخاص کو نجد روانہ کریں اور وہ اسلام کی طرف دعوت دیں تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ لوگ آپ کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ حضرت نے فرمایا: میں اہل نجد کی شرارت سے ڈرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں ان کی جان کا ضامن ہوں۔ غرض پوری طرح عہد ومیثاق لے کر حضرت نے چالیس شخصوں کو اپنے اصحاب میں سے اس کے ساتھ روانہ کیا جنہوں نے جاکر بیر معونہ ایک کنویں کے پاس قیام کیا اور ایک خط عامر بن طفیل سردار نجد کے نام لکھ کر ایک شخص کے ہاتھ بھیجا۔ عامر نے خط کھول کر پڑھا بھی نہ تھا کہ قاصد کے قتل کا حکم دے دیا

اور اہل نجد کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور ان سب کو قتل کر ڈالا، ارباب تاریخ اس واقعہ کو جنگ بیر معونہ سے تعبیر کرتے ہیں (ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام وغیرہ)

اس واقعہ سے اہل نجد کی وحشیت و بربریت اور خلاف انسانیت تعصب کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔

دعوت اسلام اور اہل نجد

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب رسالتمآبؐ نے تمام قبائل عرب کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کیا جس کے ضمن میں آپ بنی حنیفہ (اہل نجد) کے جائے قیام پر خود تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی لیکن جس بری طرح نجد نے آپ کی دعوت کو رد کیا اس کی نظیر کسی دوسرے قبیلہ میں نہیں مل سکتی۔

نجد میں جھوٹے مدعیان نبوت کی کثرت

جناب رسالتمآبؐ کے آخر عمر ہی سے غلط بیان اور دروغ گو مدعیان نبوت کی ابتدا ہوگئی تھی، لیکن تاریخ کی روشنی میں ڈھونڈھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عرب میں ایک اسود عنسی تھا جو یمن میں ظاہر ہوا اور چونکہ یمن کی خاک اپنے اندر ایمانی جوہر کو رکھتی تھی اور ان لوگوں کے طبائع ضلالت و گمراہی سے فطرتاً دور تھے، لہٰذا چند ہی روز میں وہ فتنہ خوابیدہ ہوگیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ اسود عنسی نے حجۃ الوداع کے بعد ادعائے نبوت کیا اور حضرت کی زندگی ہی میں قتل کر دیا گیا لیکن نجد میں ایک ہی ساتھ تین شخصوں نے ادعائے نبوت کیا مسیلمہ اور طلیحہ وسجاح اور مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، ان کا تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔

مسیلمۂ کذاب کا فتنہ

امام الحرمین سید زینی دحلان مفتی مکہ معظّمہ نے اپنی کتاب فتوحات اسلامیہ میں لکھا ہے کہ مسیلمہ بنی حنیفہ کے ایک گروہ کے ساتھ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں آ کر اسلام لایا اور خواہش کی کہ آپ اپنی وفات کے بعد حکومت میرے لئے قرار دیں۔ حضرت نے انکار فرمایا، جس کو دل میں لے کر وہ اپنے شہر یمامہ میں واپس چلا گیا اور وہاں ادعائے نبوت کر دیا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ میں محمدؐ کے ساتھ نبوت میں شریک قرار دیا گیا ہوں۔ تمام قبیلہ بنی حنیفہ نے اس کا اتباع کیا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بنو حنیفہ یمامہ کے رہنے والے قبائل تھے، یاقوت حموی نے **معجم البلدان** میں یمامہ کے متعلق لکھا ہے: **معدودة من بلاد نجد** یعنی یہ شہر بلاد نجد میں محسوب ہے، اور ابن آلوسی بغدادی نے جو مذہب وہابیہ کے ایک رکن ہیں، تاریخ نجد میں لکھا ہے: **ومن نواحی نجد العارض وهو المسمی بوادی حنیفة وبالیمامة وكان مركز امارة ابن سعود علی كافة نجد الحاضرة والبادية** (یعنی) نجد کے مقامات میں سے عارض ہے اور اسی کا نام وادی حنیفہ اور یمامہ ہے اور یہ تمام نجد میں حکومت ابن سعود کا مرکز رہا کیا ہے۔''

جناب رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد جب حکومت کے معاملات میں ایک حد تک یکسوئی ہوگئی تو حضرت ابوبکر کے حکم سے خالد بن ولید کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے اہل نجد سے مقابلہ کیا۔ یمامہ کی جنگ اسلامی تاریخ میں مشہور واقعہ ہے۔ مسلمانوں کا لشکر چار ہزار اور نجدیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ آخر سخت معرکہ آرائی کے بعد اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہوا اور مسیلمہ قتل ہوا، اس لڑائی میں بہت سے مشہور مہاجرین وانصار کام آئے۔ تنہا صحابہ رسولؐ میں سے چھ سو ساٹھ بزرگ اور دیگر مسلمانوں میں سے چھ سو آدمی شہید ہوئے۔ یہ سنہ بارہ ہجری کا واقعہ ہے۔ (دیکھو تاریخ خمیس وغیرہ)

اہل نجد اور مذہب خوارج

تیسرا فتنہ جو نجد ہی کا تربیت یافتہ ہے فتنۂ خوارج ہے۔ جنگ صفین میں جو فرقہ امیرالمومنینؑ کے مخالف ہوگیا اور تمام مسلمانوں کو کافر ومشرک سمجھتے ہوئے ان کے قتل وغارت میں مصروف ہوگیا اور آخر جنگ نہروان میں امیرالمومنینؑ کی تلوار سے قتل ہوا اس میں اگر غائر نظر سے تجسس کیا جائے تو اکثر فردیں اہل نجد ہی میں سے دیکھائی دیں گی۔

ہم نے اپنے رسالہ "کشف النقاب عن عقائد ابن عبدالوھاب" میں اس کو تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن اس موقع پر جناب رسالتمآبؐ کی ایک بصیرت افروز حدیث سے اس مطلب پر روشنی ڈالنا کافی سمجھتے ہیں، علامہ مجلسیؒ نے بحار میں ابوسعید خذری سے روایت کی ہے:

بعث علیؑ وھو بالیمن الی النبیؐ بذھیبۃٍ فی تربتھا فقسمھا بین اربعۃ الاقرع بن حابس وعینیہ بن بدر الفذاری و علقمۃ بن علافۃ العامری وزید بن الخیل الطائی فتغضبت قریش والانصار فقالوا یعطیہ صنادید اھل نجد ویدعنا قال انما انا اتالفھم فاقبل رجل غائر العینین ناتی الجبینین کث اللحیۃ مشرف الرجنتین محلوق الراس فقال یا محمد اتق اللہ قال فمن یطیع اللہ اذا اعصیۃ فیا منی علی اھل الارض ولاتامنونی نسئال وجال من القوم قتلہ اراہ خالد بن الولید فمنعہ فلما ولی قال ان من صنضئی ھذا قوماً یقرأون القرآن لا یجاوز حناجرھم یمرقون من الاسلام مروق السھم من الرمیۃ یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان ان ادرکتھم لقتلتھم قتل عاد۔

امیر المومنینؑ نے جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں ایک مقدار طلائے خالص کی روانہ کی۔ حضرت نے چار آدمیوں کے درمیان میں اس کو تقسیم کر دیا اقرع بن حابس وعینیہ بن بدر فذاری وعلقمہ بن علافہ عامری وزید بن خیل طائی۔ قریش اور انصار رنجیدہ ہوئے اور کہا کہ نجد کے بڑے بڑے آدمیوں کو دیا جاتا ہے اور ہم محروم ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں ان کی تالیف قلب کرتا ہوں اسی اثنا میں ایک شخص حلقوں وار آنکھیں، ابھری ہوئی کنپٹیوں گھنی ڈاڑھی، منڈے ہوئے سر والا آیا اور کہا کہ اے محمدؐ خدا سے ڈرو۔ حضرت نے فرمایا: اگر میں خدا کی معصیت کروں تو مطیع اس کا کون ہے، خدا نے تو تمام عالم پر مجھ کو امین کیا ہے اور تم لوگ مجھ پر اطمینان نہیں رکھتے۔ اصحاب میں سے کسی شخص نے جو ظاہراً خالد بن ولید تھے اس کے قتل کی اجازت چاہی۔ حضرت نے منع کیا اور جب وہ شخص چلا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے قبیلہ سے کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے، اس طرح کہ ان کے گلوں کے نیچے نہ اترے گا اور اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے، وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور اہل اصنام سے تعرض نہ کریں گے، اگر میں ان کو پاتا تو قبیلۂ عاد کی طرح قتل کرتا۔

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ذوالخویصرہ قبیلہ بنی تمیم میں سے تھا، اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل نجد ہمیشہ سے اسلام کی عداوت رکھتے تھے جس کی وجہ سے تمام قبائل قریش سے زیادہ رسولؐ کو ان کی تالیف قلب کی ضرورت تھی۔

اس کے علاوہ ذوالخویصرہ تمیمی کے متعلق حضرت نے فرمایا ہے کہ اس کے قبیلہ سے وہ گروہ ہوگا جو عبادت میں ممتاز ہوگا لیکن مسلمانوں کے قتل میں دریغ نہ کرے گا۔ اس قسم کے احادیث سب خوارج سے تعلق رکھتے ہیں اور ان اوصاف کو اگر وہابی گروہ پر منطبق کیا جائے تو ایک سر مو فرق نہ نکلے گا۔

ذوالخویصرہ کا قبیلہ بنی تمیم نجد کے مشہور قبائل میں سے ہے اور خوارج نہروان، سپہ سالار شبث بن ربعی قبیلہ بنی تمیم سے تھا اور خوارج بصرہ کا رئیس مسعر بن فدکی بھی تمیمی تھا اور اس کے بعد اگر نظر متتبع کو ذرا وسعت دو تو معلوم ہوگا کہ ابن عبدالوہاب نجدی بھی تمیمی تھا اس کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے "محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن شرف بن عمر بن بعفاوین رئیس بن زاخر بن محمد بن علی بن وہیب التمیمی، اس کے علاوہ خوارج نہروان کے سرداروں میں زرعہ بن ہرج طائی تھا اور اجاؤ سلمیٰ جو طئے کے دونوں پہاڑ ہیں وہ نجد کی سرزمین پر ہیں۔

نجد سے فرقہ اباضیہ کا ظہور

اباضیہ گروہ فرقہ خوارج کی ایک شاخ ہے، عمان ومسقط

میں اس مذہب کو پوری مرکزیت حاصل ہے اور زنگ بار میں اس فرقہ کے افراد کثرت سے موجود ہیں، سال گذشتہ سرفراز جب نمبر میں ہم نے اس فرقہ کے متعلق اپنی ناچیز معلومات کو اجمالی طور پر لکھا ہے، ان کا مورث اعلیٰ عبداللہ بن اباض بھی نجد کا پروردہ تھا اباض بضم ہمزہ جو یمامہ کے صوبہ عرض کا ایک گاؤں ہے وہیں سے یہ شخص پیدا ہوا تھا اور اسی مناسبت سے اس فرقہ کو اباضیہ کہا جاتا ہے اس شخص کے خروج کا واقعہ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔

نجد سے پانچواں فتنہ

دوسری صدی ہجری کے واقعات میں سے نجدہ بن عامر کا خروج ہے، ابن اثیر نے کامل التواریخ میں لکھا ہے کہ یہ شخص عجیب وغریب عقائد رکھتا تھا اور اپنے تئیں امیرالمومنین کہلواتا تھا، شہرستانی نے ملل ونحل میں فرقہ نجدات عاذریہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ لوگ نجدۃ بن عامر حنفی کے اتباع ہیں۔ (حنفی امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت نہیں بلکہ بنی حنیفہ کی طرف ہے جو نجد کا مشہور قبیلہ ہے) یہ شخص یمامہ میں ظاہر ہوا تھا اور علامہ ابن ابی الحدید کی تحریر کے موافق یمامہ ونجد میں اس کو پوری طاقت حاصل ہوگئی تھی، یہاں تک کہ یمن وطائف وعمان وبحرین ووادی تیم وعامران تمام مقامات پر قبضہ کرلیا تھا۔

چھٹا فتنہ

نافع بن ازرق خارجی یہ شخص بھی بنی حنیفہ اہل نجد میں سے تھا اس کا عقیدہ یہ تھا کہ حجاز دارلکفر ہے اور تمام مسلمان کافر ومشرک ہیں اور ان کا ذبیحہ حرام ہے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

یاقوت حموی نے **معجم البلدان** میں نقل کیا ہے کہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں دس آدمی خوارج میں سے لائے گئے جن میں ۹ قتل ہوگئے دسواں شخص قتل کے لئے لایا گیا تھا کہ بجلی چمکی اور اس شخص کی زبان سے یہ اشعار نکلے۔

تالق البرق نجدا فقلت له
یا ایها البرق انی عنك مشغول

(یعنی) نجد کی جانب سے بجلی چمکی تو میں نے کہا کہ اے برق تابندہ مجھ کو تیری طرف توجہ کا موقع نہیں۔

بذلة العقل حیران بمعتكف
فی كفه كحباب الماء مسلول

اسیری کی ذلت میں سرگشتہ وحیران اس حالت میں ہوں کہ سر پر پانی کی لہروں کی سی تلوار کھینچی ہوئی ہے۔

عبدالملک نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تجھ کو اپنا وطن یاد آیا ہے، اس نے کہا کہ بے شک ایسا ہی ہے، عبدالملک نے اس کو رہا کردیا، درحقیقت خوارج کے افراد کا بیشتر تعلق نجد کی سرزمین سے ہے۔

زمین نجد سے قرامطہ کا خروج

چوتھی صدی ہجری میں راضی باللہ ابوالعباس محمد بن مقتدر عباسی کا زمانہ تھا کہ نجد سے قرامطہ نے خروج کیا اور تمام بلاد میں فتنہ وفساد برپا کردیا، مکہ معظّمہ پر قبضہ کرکے مسلمانوں کے کفر کا فتویٰ دیا اور ان کے ساتھ مشرکین کا سا برتاؤ کیا، ان کے واقعات پر اگر نظر کی جائے تو بہت کچھ وہابی گروہ سے ملتے جلتے ہیں، وہ بھی مسلمانوں کو بے دین سمجھتے تھے اور قتل ان کا واجب جانتے تھے، قرامطہ کے فتنہ نے سرزمین عرب میں پوری اہمیت حاصل کرلی تھی جس کی وجہ سے مختلف ممالک اسلامیہ کے حج موقوف کر دیا گیا تھا بغداد کے علما نے فتویٰ دیا کہ کوئی شخص حج کو نہ جائے چنانچہ ۳۲۳ھ تک پانچ سال حج ملتوی رہا (تاریخ الخلفاء وعینی شرح کنزالدقائق) بلکہ بعض علمائے اہلسنت نے فتویٰ دیا تھا کہ حج بیس سال سے فرض نہیں ہے جس سے اس فتنہ کی طول مدت کا پتہ ملتا ہے (فتاویٰ قاضی خاں)

اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ یہ فتنہ بھی نجد ہی کی آب وہوا کا تربیت یافتہ تھا، **قاموس الامکنۃ والبقاع** میں زمین نجد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ **ھی قسمان نجد**

الحجاز ونجد العارض وقد خرج منها القرامطه ومسیلمة الکذاب والوهابیون۔ نجد دوحصوں پر منقسم ہے نجد الحجاز اور نجد البارض اور انھیں بلاد نجد سے قرامطہ نے خروج کیا اور مسیلمہ کذاب نمودار ہوا اور یہیں سے وہابی فرقہ کا ظہور ہوا ہے اس کے بعد کوئی شبہہ باقی نہیں رہ سکتا۔

وهابی فرقه کی ابتدائی نشوونما

یہی نجد کی سرزمین ہے جس سے بارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے فتنۂ وہابیہ کا ظہور ہوا اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے خیالات وعقائد کے لئے اس وحشی وجہالت خیز فتنہ پرور زمین سے زیادہ کوئی جگہ مناسب مل بھی نہیں سکتی تھی، اس ملک کے سابقہ روایات خود اس تحریک کی کامیابی کے کافی ضامن تھے، چنانچہ محمد بن سعود سردار قبیلہ عنیزہ کی قیادت میں یہ فتنہ پوری طرح اطراف نجد پر مستولی ہوگیا اور آخر وہ نتائج برآمد ہوئے جنھوں نے انسانیت کے دامن پر ہمیشہ کے لئے دھبا لگادیا۔

ابن عبدالوہاب کے خیالات وتعلیمات میں تشدد، ناروا داری، ظلم وستم، بے جا تعصب کے دفعات خصوصیت کے ساتھ قرار دیئے گئے ہیں جن کو اسلامی شریعت اور دعوت اسلام کے پردہ میں دنیا کے سامنے لایا گیا تھا اور اپنے اغراض نفسانیہ کی حصول کے لئے اسلامی روایات کو پوری طرح پامال کیا گیا تھا۔

اس فرقہ کی ابتدائی نشوونما ۱۱۶۰ھ میں ہوئی ہے اور جب سے اس نے عالم وجود میں قدم رکھا مسلمانوں کی خونریزی اس کا اہم ترین فریضہ رہا کیونکہ محمد بن سعود نے ابن عبدالوہاب کی بیعت اسی شرط پر کی تھی کہ وہ اس کے مخالفین کے قتل میں کوئی دریغ نہ کرے گا، جس کا نام جہاد فی سبیل اللہ رکھا گیا تھا، (دیکھو تاریخ نجد ابن آلوسی بغدادی)

پھر جس مذہب کی بنیاد مسلمانوں کی خونریزی پر قرار دی گئی ہو اس سے کیا رواداری کی توقع ہوسکتی ہے، چنانچہ وہی ہوا کہ اس کے قدم نجد میں جمنا تھے کہ ملک عرب میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا اور سیکڑوں بے گناہ جانیں ان سفاک ظالموں کی خوں آشام تلواروں کی نذر ہوگئیں۔

نجد میں پورے طور پر اثر قائم ہونے کے بعد دوسرے ممالک اسلامیہ کی طرف ان کے دست حرص وآزار کا بڑھنا لازمی تھا۔ چنانچہ کئی مرتبہ پوری طاقت کے ساتھ عراق پر حملہ کیا، ان حملوں کی فہرست اور مختصر تفصیل ہم گذشتہ سال کے ماہ شوال میں اخبار سرفراز لکھنؤ کے مقالہ میں درج کرچکے ہیں۔

اسی دوران میں حرمین شریفین خدا ورسولؐ یعنی مکہ معظمہ ومدینہ منورہ پر ان کا قبضہ ہوگیا اور ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۲۰ھ تک شریف غالب سے جنگ قائم رہنے کے بعد شریف کو حجاز ان کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خالی کردینا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس گروہ نے حرمین کی پوری بے حرمتی کی اور ان بلاد مقدسہ کو دارالحرب قرار دیا، حجرہ نبیؐ کے خزانہ میں جتنا زروجواہر اور مال واسباب تھا سب لوٹ کر لشکر میں تقسیم کردیا گیا، اس کی تفصیل جبرتی نے تاریخ عجائب الاثار میں لکھی ہے، باوجودیکہ یہ شخص وہابیوں سے حسن ظن رکھتا ہے اور ان کے افعال کی قصیدہ خوانی اس کی کتاب کے اکثر مقامات پر نظر آتی ہے۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کو حج سے منع کردیا گیا اور منادی نے مکہ میں اعلان کیا کہ انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا۔ جس کی وجہ سے ملک شام ومصر سے حج موقوف ہوگیا اور ۱۲۲۱ھ سے چند سال تک حجاج کو محروم رہنا پڑا ۱۲۲۳ھ میں ابن سعود نے حکم دیا کہ جتنے قبہ مکہ معظمہ کے اندر جنة المعلی میں ہیں سب گرادئے جائیں چنانچہ جتنے مساجد ومشاہد مکہ معظمہ میں تھے وہ سب منہدم کردئے گئے، جنة المعلی کے تمام مقابر مولد نبی، مولد ابوبکر، قبۂ خدیجہ، اور جہاں جہاں ائمہ وصالحین کے آثار تھے سب کو زمین کے برابر کردیا گیا اور یہ لوگ مشاہد ومقابر کے انہدام کے وقت باجے بجا بجا کر گاتے تھے اور اہل قبور کو سب وشتم کرتے تھے کہ یہ وہ معبود ہیں جن کی غیر خدا پرستش کی جاتی تھی (خلاصة الکلام علامہ زینی دحلان شافعی مفتی مکہ معظمہ)

مدینہ منورہ کے قبور کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا لیکن اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر احساس مذہبی کا فقدان نہ تھا اور سلاطین کے دل میں حمیت وغیرت اسلام تھی۔ مصر سے لشکر بھیجا گیا اور اس نے حجاز کو وہابی اثرات سے بالکل صاف کر دیا اور نجد کے بلاد کو تباہ و برباد کر کے اس فرقہ کی پوری طرح سرکوبی کر دی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ پھر ان کو قوت حاصل ہونے لگی اور برابر فتنہ وفساد کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے مگر حکومت ٹرکی کے رعب وہیبت سے ان کو سر اٹھانے کا موقع نہ تھا۔

ماضی وحال میں تطابق

عرب کا مقولہ ہے التاریخ یعید نفسہ تاریخ اپنے تیئں ہمیشہ دہرایا کرتی ہے، موجودہ زمانہ میں اسلام کو نجدی گروہ کے ہاتھوں میں جن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا یہ بھی اسی آغاز کا انجام ہے۔

موجودہ چار سال کے واقعات جنھوں نے مسلمانوں کو داغدار بنا دیا ہے کسی تبصرہ کے محتاج نہیں، ہلال شوال خود ائمہ بقیع کا مرثیہ خواں اور اس کی آٹھویں تاریخ ان مشاہد مشرفہ کے لئے سوگ پوش ہے، اب شکوہ وشکایت اور مسلمانوں کی غیرت وحمیت کا مرثیہ پڑھنا بھی تقویم پارینہ ہو چکا ہے اور سلاطین اسلام کی ہمت وجوش مذہبی کی یاددہانی بھی شغل بے کاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

جبکہ خود اسلامی ممالک سے شرعی روایات کو رخصت کیا جا رہا ہے اور داخلی انتظامات کے ذیل میں اسلامی خودداری کو پامال کرنے کا پورا سامان کر دیا گیا ہے اس حالت میں سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ بارگاہ احدیت میں نصرت وتائید غیبی کے لئے دست دعا بلند کیے جائیں ''شاید'' مردے از غیب برون آید وکارے بکند۔ اللھم عجّل فرج ولیک وابن ولیک وسھل مخرجہٗ۔

(علی نقی النقوی بقلمہ از نجف اشرف، عراق)

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ فروری ۱۹۲۹ء

(۲) جنت البقیع میں قبر بضعۃ الرسولؐ

ابن سعود کے کاغذی لشکر کا مشہور قائد ''اخبار زمیندار'' لاہور مورخہ ۱۶ جون ۱۹۲۶ء ہمارے پیش نظر ہے۔ جنت البقیع کی بربادی کے متعلق مولانا قطب الدین عبدالولی صاحب فرنگی محلی کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے اخبار مذکور رقمطراز ہے۔

ہم مولانا قطب الدین عبدالوالی سے صرف اس قدر استفسار کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ حضرت خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جسد اطہر جنت البقیع میں مدفون ہے یا حضور سرور کون ومکاںؐ کے پائینتی خود گنبد خضرا کے شمالی گوشہ میں محو آرام ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ اگر فی الحقیقت مقام ثانی الذکر ہی میں سپرد خاک کی گئیں تو پھر جنت البقیع والا مقبرہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کے انہدام پر آنسو بہانا لا حاصل ہے۔''

اگرچہ اخبار مذکور نے جواب کی ذمہ داری مولانا موصوف ہی کی طرف عائد کی ہے اور استفسار انہیں سے ہے مگر چونکہ احقاق حق ہر حق پرست کا فرض ہے لہٰذا اس غلط فہمی کا دفعیہ ضروری ہے۔

درحقیقت اگر جمہور علمائے اسلام کی کتابوں کا تتبع کیا جائے اور اکثریت کے مقابلہ میں اختلافی اقوال شاذ ونادر جن سے بمشکل کوئی مسئلہ خالی ملے گا قابل لحاظ نہ سمجھے جائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جناب سیدہؑ کا مزار مقدس جنت البقیع ہی میں ہے، نہ اور کسی جگہ چنانچہ اس وقت اجمالاً بعض علمائے معتبرین کے تصریحات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۱) جلیل القدر عالم شیخ مومن شبلنجی اپنی کتاب نور الابصار میں لکھتے ہیں:

توفیت رضی اللہ عنہا لیلۃ الثلثاء لثلاث خلون من شھر رمضان سنتہ احدی عشرۃ وھی نبت ثمان وعشر ین سنۃ ودفنت بالبقیع لیلا

وصلی علیھا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقیل صلی علیھا العباس رضی اللہ عنہ ونزل فی قبر ھا ھو وعلی والفضل بن عباس۔

ان معظمہ نے شب سہ شنبہ ۳ماہ رمضان کو ۱۱ھ میں انتقال کیا اور آپ کا سن اس وقت ۲۸ سال تھا اور بقیع میں شب کے وقت دفن ہوئیں اور امیر المومنین حضرت علیؑ نے نماز جنازہ پڑھی اور کسی نے کہا ہے کہ حضرت عباس نے نماز پڑھی تھی اور قبر میں حضرت علیؑ اور عباس اور فضل بن عباسؓ اترے تھے۔

(۲) علامہ شیخ محمد الصبان اسعاف الراغبین میں بذیل تذکرہ امام حسنؑ تحریر کرتے ہیں:

مات سنۃ خمسین علی ما علیہ الاکثر وقیل سنۃ تسع واربعین ورجحہ بعضھم وقیل غیر ذالک ودفن بالبقیع فی جنب امہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا۔ ۵۰ھ میں وفات پائی جیسا کہ اکثر کا قول ہے اور بعض نے ۴۹ھ میں اور کچھ لوگوں نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کسی نے کچھ اور بھی کہا ہے اور حضرت بقیع میں اپنی والدۂ ماجدہ (سیدہ عالم) کے پہلو میں دفن ہوئے۔

(۳) مورخ مشہور ابوالعباس احمد بن یوسف دمشقی تاریخ اخبار الدول وآثار الاول میں رقمطراز ھیں۔

لما توفی رضی اللہ عنہ ادخلہ قبرہ اخوہ الحسین و محمد بن الحنفیۃ و عبداللہ بن عباس ودفن بالبقیع بعد ان اوصی ان یدفن عند جدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسمحت لہ عائشۃ بذالک و منعہ مروان فانہ کان والی المدینۃ فلبس الحسین ومن معہ السلاح حتی ردہ ابوھریرہ ثم دفن بالبقیع الی جنت امہ۔

جب حضرت امام حسنؑ کا انتقال ہوا تو ان کو قبر میں ان کے بھائی امام حسینؑ اور محمد بن حنفیہؒ اور عبداللہ بن عباسؓ نے اتارا اور حضرت بقیع میں دفن ہوئے بعد اس کے کہ آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے حضرت رسولؐ کے پاس دفن کرنا اور حضرت عائشہ نے اس کی اجازت بھی دے دی تھی مگر مروان نے کہ جو اس وقت والی مدینہ تھا روکا جس پر حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی مسلح ہوگئے مگر ابوہریرہ صحابی رسول نے روکا پھر امام حسنؑ بقیع میں اپنے مادر گرامی (حضرت زہراؑ) کے پہلو میں دفن ہوئے۔

(۴) سیرت نبیؐ کی مشہور کتاب انسان العیون میں ہے۔

حتی رضی بدفنہ بالبقیع فدفن بجانب امہ رضی اللہ عنھما۔

امام حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کو بقیع میں دفن کرنے پر راضی ہوگئے۔ پس وہ حضرت اپنے ماں (حضرت سیدہؑ) کے پہلو میں دفن ہوئے۔

(۵) محدث شیخ عبدالحق دہلوی نے جذب القلوب الی دیار المحبوب میں اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس کے بہت سے شواہد کا تذکرہ کیا ہے۔

(۶) مولانا سید صدرالدین احمد بوہاری نے روایح المصطفیٰ من ازھار المرتضیٰ میں حضرت سیدہ کے حالات میں لکھا ہے۔

''در قبر اختلاف است بالقطع ہیچ کس را معلوم نیست ارجح اقوال در جنت البقیع نزد قبر امام حسن علیہ السلام بودہ است۔

بنظر اختصار چند تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے اگر تتبع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمہور علمائے اسلام کے تصریحات اسی قول کے مؤید ہیں اور دوسرا قول شاذ ہے۔ ایسی صورت میں اخبار زمیندار کا یہ شبہ بجز غلط فہمی پھیلانے کے اور کسی امر پر محمول نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ایک تدبیر منجملہ ان تدابیر کے ہے جس سے ابن سعود کی نصرت میں اس وقت کام لیا جارہا ہے۔ واللہ یحق الحق وھو احکم الحاکمین۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ، ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ / جولائی ۱۹۲۶ء

(۳) روضۂ نبیؐ

چونکہ اس زمانہ میں روضۂ جناب رسالت مآبؐ پر نجدیوں کے مظالم کے اخبار آرہے ہیں اور بعض لوگ عمارت قبر کے مسئلہ میں غلطاں ہیں، اس لئے اس موقع پر میں خاص روضۂ رسالتمآب کی تاریخ کے عنوان سے ایک تبصرہ ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتا ہوں جس سے یہ ثابت ہوگا کہ کس کس زمانہ میں کس کس شخص نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

کتب تاریخ وسیر وحدیث کے انکشاف اور ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل دو گھر بنوائے تھے ایک ام المومنین عائشہ کے لئے اور ایک ام المومنین سودہ کے لئے یہ دونوں گھر مثل مسجد کے اینٹوں اور درخت خرما کی لکڑیوں سے تیار ہوئے تھے۔ ام المومنین عائشہ کے گھر کا دروازہ ایک پٹ کا تھا جو عرعر یا ساکھو کا تھا۔ اس کے بعد ازواج نبی کے لئے انہی سے متصل ۷ حجرے بنے تھے۔ یہ حجرہ جو حجرۂ عائشہ کہا جاتا ہے۔ شوال ۲ھ میں بنا تھا۔ یہ تمام حجرے مسقّف تھے مگر اتنی نیچی چھت تھی کہ حسن بصری سے نقل ہے کہ میں بچپنے میں جناب رسالتمآب کے گھروں میں جایا کرتا تھا تو چھت کو اپنے ہاتھ سے چھو لیتا تھا۔ یہ حجرہ مسجد سے بالکل متصل تھا اور اتنا متصل کہ خود حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب حضرت مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو میں اپنے حجرہ سے ان کے بالوں میں شانہ کر دیا کرتی تھی۔ جناب رسالتمآبؐ اپنے زمانۂ حیات میں روزانہ ایک زوجہ کے یہاں شب بسر کرتے تھے اور جب وفات ہوئی ہے تو اس شب کو جناب رسالتمآبؐ حجرہ حضرت عائشہ میں تھے اور وہیں انتقال کیا۔ (دیکھو صحیح بخاری)

انتقال کے بعد لوگوں میں اختلاف شروع ہوا کہ رسولؐ کہاں دفن ہوں لیکن بعض صحابہ نے کہا کہ ہم نے رسالتمآبؐ سے سنا ہے کہ نبی وہیں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی قبض روح ہوتی ہے۔ اس کلیہ پر نظر کرتے ہوئے جناب رسالتمآبؐ کو حجرۂ حضرت عائشہ میں دفن کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو انسان العیون)

اس کے بعد جب حضرت ابوبکر کا وقت وفات قریب پہنچا تو انہوں نے عائشہ سے وصیت کی کہ مجھ کو جناب رسالتمآب کے پہلو میں دفن کرنا لہذا جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کی قبر رسالتمآب کی قبر سے متصل بنی اس طرح کہ ان کا سر جناب رسالتمآبؐ کے شانۂ اقدس کے پاس تھا (تاریخ الخلفا)

ابھی تک حجرہ حضرت عائشہ میں سوائے لکڑیوں کے اور کسی چیز کی چہار دیواری نہ تھی سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب نے اس کی بیرونی دیواریں تعمیر کرائیں۔

(دیکھو وفاء الوفاء لاخبار دار المصطفیٰ)۔

اس کے بعد جب حضرت عمر کا وقت انتقال قریب پہنچا تو حضرت عائشہ کے پاس کہلا بھیجا کہ مجھ کو اجازت ہے کہ میں جناب رسالتمآب اور خلیفۂ اول کے پاس دفن ہوں۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ یہ جگہ میں نے اپنی قبر کے لئے اٹھا رکھی تھی مگر عمر کو میں اپنے نفس پر ترجیح دے کے اجازت دیتی ہوں۔ اسی اجازت کی بنا پر حضرت عمر کی قبر بھی ان قبروں کے پاس بنی۔ (تاریخ الخلفاء)۔

اگرچہ حضرت عمر خطاب نے اپنے زمانہ میں حجرہ کی دیوار بنا دی تھی مگر ابھی تک مخصوص قبروں کی حفاظت کے لئے حجرہ کے اندر کوئی دیوار نہ تھی جب حضرت عمر خطاب دفن ہوئے تو حضرت عائشہ کو اس کی ضرورت ہوئی چنانچہ ابن زبالہ نے خود حضرت عائشہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب تک جناب رسالتمآب اور خلیفۂ اول میرے حجرے میں دفن تھے میں بغیر مقنع ڈالے اور چادر اوڑھے اپنے حجرہ میں رہتی تھی مگر جب سے خلیفۂ ثانی دفن ہوئے میں کپڑوں میں نہاں رہنے لگی یہاں تک کہ میں نے اپنے اور قبروں کے درمیان دیوار بنا دی اور بعض مورخین نے یہ ضرورت تعمیر جدار کی بتلائی ہے کہ لوگ قبر کی مٹی لیجایا کرتے تھے لہذا حضرت عائشہ نے دیوار بننے کا حکم دیا اور دیوار تیار ہوگئی لیکن اس میں ایک موکھا باقی تھا اس میں سے لوگ مٹی لے جایا کرتے تھے

حضرت عائشہ نے وہ موکھا بھی بند کر دیا۔

اس کے بعد سے عبداللہ ابن زبیر کے عہد تک اس حجرہ میں کسی تغیر کا پتہ تاریخوں سے نہیں ملتا مگر بیان سابق سے صاف صاف واضح ہے کہ رسولؐ کی آنکھوں کو دیکھنے والے اور رسولؐ کی زبان وحی ترجمان کے الفاظ اپنے کانوں سے سننے والے صحابہ کی موجودگی میں جبکہ کسی خلاف شریعت امر کے وقوع کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا سب سے پہلے خود حضرت عمر بن خطاب نے قبر رسولؐ پر بنا قائم کی اور جس حجرہ میں قبر رسول تھی اس کی دیواریں تعمیر کرادیں اور پھر خود حضرت عائشہ نے اپنے اور قبر رسول کے درمیان میں دیوار بنوا کر قبر رسول کے چاروں طرف دیواروں کی بنا قائم کردی اور چھت اس کی بجائے قبہ کے بدستور قائم رکھی، جس سے واضح ہے کہ بناعلی القبور کی نہی تنزیہی بھی قبور انبیاء و ائمہ سے متعلق نہیں ہے ورنہ خلفائے راشدین کا عہد کبھی اس کو جائز و مستحسن نہ قرار دیتا۔

بالجملہ جب حضرت عبداللہ ابن زبیر کا عہد آیا تو حجرہ کی وہ بیرونی دیواریں جو حضرت عمر خطاب نے تعمیر کرائی تھیں چھوٹی تھیں عبداللہ بن زبیر نے ان کو اونچا کرا دیا۔ (وفاء الوفاء)۔

پھر جب ولید بن عبدالملک کو اپنے زمانہ میں توسیع مسجد رسول کا خیال ہوا تو اس حجرہ کی دیواریں منہدم ہوئیں اور عمر بن عبدالعزیز کے اہتمام سے پھر تعمیر شروع ہوئی اسی اثنا میں ایک قدم ظاہر ہوا جس کے متعلق اشتباہ تھا کہ کس کا پاؤں ہے عروہ نے کہا کہ یہ رسالتمآبؐ کا پاؤں نہیں ہے عمر بن خطاب کا پاؤں ہے۔ (دیکھو صحیح بخاری)

بہر حال ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیز نے ان قبور کے حظیروں کو تعمیر کروایا اور مسجد کی سقف کے نیچے خاص اس حجرہ کی ایک بہت مستحکم چھت تیار کرادی۔ اب ایک عرصہ تک تاریخیں اس حجرہ میں پھر کسی تغیر کے بتانے سے خاموش ہیں مگر یہ تغیرات بھی جو خلفائے بنی امیہ کے ازمنہ میں ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق بھی کسی منکر کا کوئی انکار منقول نہیں ہے حالانکہ ان زمانوں میں بھی اکثر صحابی و تابعی موجود تھے۔

پھر جب خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہو کر خلافت بنی عباس کا زمانہ آیا تو ہارون رشید کی خلافت میں اس کے ایک گورنر ابوالبختری نے زمانۂ مدینہ میں کچھ دھنیاں سقف مسجد کی جو قبر رسول کے اوپر تھیں شکستہ ہوگئی تھیں ابوالبختری نے تمام مسجد کی چھت کھلوا کے جتنی لکڑیاں ناقص تھیں نکلوا ڈالیں کہا جاتا ہے کہ ستر لکڑیاں شکستہ ملیں ان کے عوض میں نئی دھنیاں داخل کر کے نئے سرے سے تمام مسجد کی اور اس حجرۂ مقدسہ کی چھت ۱۹۳ھ میں تعمیر کی گئی۔

بعد اس کے بنا بر قول ابن نجار کے متوکل نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے عامل حرمین اسحاق بن سلمہ کو حکم دیا کہ حجرۂ نبوی کا سفید پتھر سے استحکام کر دیا جائے چنانچہ اس کے حکم سے تقریباً ۲۴۰ھ میں اس حجرہ کی نیو کو سفید پتھروں سے جس کا نام رخام ہے مضبوط کر دیا گیا۔

پھر مستضیٔ باللہ کے زمانۂ خلافت میں ۵۴۸ھ میں جمال الدین وزیر بنی زنگی نے اس پتھر کی تجدید کی اور نیو کے اوپر بھی ایک قد آدم تک سفید پتھر لگوا دیئے۔

اسی کے چند سال کے بعد جیسا کہ بعض مورخین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے زمانۂ خلافت مستضیٔ باللہ بن مستنجد باللہ میں ایک دھما کے کی آواز اس حجرہ کے اندر سے آئی۔ اس کی اطلاع خلیفۂ وقت کو دی گئی خلیفہ نے تمام فقہا سے مشورہ لیا۔ سب نے یہ فتوی دیا کہ ایک شخص فاضل مسجد کے خدام میں سے اس حجرہ کے اندر داخل ہو اور اطلاع حاصل کرے کہ کیا واقعہ ہے۔ اس مہم کے لئے تمام مسلمانوں نے ایک شخص کو جس کا نام بدر تھا منتخب کیا۔ وہ ایک ضعیف العمر فاضل شخص تھا جو قائم اللیل اور صائم النہار تھا اور بنی عباس میں سے تھا۔ وہ حجرۂ شریفہ کے اندر داخل ہوا اور اس نے دیکھا کہ اندرونی دیوار حجرہ کے مغربی جانب کی گرگئی ہے کچھ اینٹیں مسجد ہی کی مٹی سے تیار کر کے مہیا کی گئیں اور وہ دیوار پھر بنا دی گئی اور جس طرح تھی تعمیر ہوگئی یہ واقعہ بنا بر بعض اقوال تقریباً ۵۷۰ھ کا ہوگا۔

پھر ۶۵۴ھ میں یہ عظیم واقعہ گذرا کہ شب جمعہ یکم رمضان کو مسجد نبوی میں آگ لگ گئی اور ہر چند اہل مدینہ نے اس کے بجھانے میں سخت کوشش کی مگر وہ نہ بجھی یہاں تک کہ کوئی لکڑی سقف مسجد کی ایسی نہ رہی جو سالم رہی ہو اور جتنا سامان مسجد کا تھا مثلاً منبر اور دروازہ اور خزانہ اور کٹہرے اور صندوق اور کتابیں اور پردے سب جل گئے اور اس آتشزدگی کی شدت میں وہ چھت جو حجرۂ نبی میں سب سے اوپر تھی اس چھت پر گر پڑی جو خاص قبروں پر تعمیر ہوئی تھی اور اس کے بار سے یہ چھت بھی، دونوں چھتیں قبور کے اوپر حجرہ میں گر پڑیں۔ اس عظیم واقعہ کی اطلاع خلیفۂ وقت مستعصم باللہ ابی احمد عبداللہ بن مستنصر باللہ کو دی گئی اور وہاں سے سامان تعمیر اور کاریگر وغیرہ سب بھیج دیئے گئے اور پھر تعمیر مسجد و روضۂ رسول اوائل ۶۵۵ھ میں شروع ہوئی اور پھر ایک چھت کی تعمیر اس حجرۂ مقدسہ پر بہت استحکام کے ساتھ کردی گئی۔

ابھی تک اس حجرۂ مقدسہ کے اوپر کوئی قبہ نہ تھا بلکہ سطح مسجد پر اس حجرہ کی مقدار بھر اس کے گرد ایک خطیرہ نصف قد آدم اونچا اینٹوں کا بنا ہوا تھا تا کہ حجرہ کا امتیاز باقی سقف مسجد سے معلوم ہو لیکن زمانۂ بادشاہ منصور قلادون صالحی میں قبۂ خضراء کی تعمیر ہوئی ۶۷۸ھ میں یہ قبہ تیار ہوا جو نیچے سے چہار گوشہ اور اوپر سے ہشت گوشہ تھا اس کے اوپر ایک موکھا تھا جس میں سے کوئی نظر کرے تو حجرہ کی داخلی چھت نظر آسکتی تھی لیکن اکثر مورخین کے کلام سے تصریحاً اس قبہ کے تعمیر کرانے والے کا نام نہیں ملتا ہاں بعض کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قبہ کو ضریح نبوی پر کمال احمد بن برہان عبدالقوی ربعی ناظر قوص نے تعمیر کرایا تھا اور مقصود اس سے تحصیل ثواب تھا۔

اس کے بعد پھر اس قبہ کی تجدید ملک ناصر حسن بن محمد بن قلادون نے زمانۂ سلطنت ملک اشرف شعبان بن حسین محمد میں ۷۶۵ھ میں کرائی۔

اس کے بعد پھر اس حجرہ میں ۸۳۱ھ میں کچھ نقصان پیدا ہوا تھا، جس کا ملک اشرف برسبائی نے اسی سال کے ماہ ذی القعدہ میں استحکام کرایا یہ عمارت غالباً کچھ زیادہ مضبوط نہیں بنی تھی لہٰذا چند ہی سال کے بعد ۸۵۳ھ میں پھر زمانۂ دولت طاہر حقمبق میں اس کی مرمت کی ضرورت ہوئی۔

اس کے بعد ۸۸۱ھ میں خواجہ شمسی امیر جدہ کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے اور تعمیر کی خدمت کو اپنے متعلق کیا۔ حجرۂ شریفہ کی بیرونی چھت کو تھوڑا سا بلند کردیا گیا اور قبۂ خضراء کی بعض لکڑیوں میں بھی کچھ نقصان پیدا ہو گیا تھا جس کو شمس بن زمن نے درست کرادیا۔

۸۸۶ھ میں پھر مسجد نبی میں ۱۳ رمضان کو آگ لگی اس آتشزدگی سے تمام مسجد کو ضرر پہنچا اور قبۂ خضراء جو سب سے بلند تھا وہ بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہا اور منہدم ہو گیا لیکن خاص اس حجرہ میں کوئی اثر نہیں ہوا جو قبور پر محیط تھا۔ امیر شمس الدین بن زمن کے اہتمام سے پھر اس عمارت کی تجدید ہوگئی اور قبہ تیار کردیا گیا۔

اس کے بعد ۸۹۲ھ میں یہ قبۂ مطہرہ اوپر سے شق ہو گیا اور ماہران فن معماری کی رائے اس امر پر قائم ہوئی کہ یہ ظاہری ترمیم سے درست نہیں ہوسکتا لہٰذا سلطان شجاعی شاہین جمالی کے حکم سے اس قبہ کی نئے سرے سے تعمیر کی گئی اور سابقہ عمارت سے زیادہ استحکام کو صرف کیا گیا اور عظیم قبہ تیار ہو گیا۔

اس نویں صدی ہجری کے بعد جو جو تغیرات اس روضۂ رسول میں ہوئے ہیں ان کے بتانے کے لئے کوئی تاریخ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔

نتیجۂ کلام

اس تبصرہ سے ہمیں اس امر کا ظاہر کرنا تھا کہ ہر عہد میں مسلمانوں کو اس عمارت کی بقا میں کتنا اہتمام رہا اور ہر زمانہ میں بادشاہان اسلام نے اس کے استحکام میں کیا کیا کوششیں کیں ہیں اور کبھی کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور نہ اس کو برا سمجھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر عہد میں مسلمان اس عمارت کی بقا کو اچھا سمجھتے تھے اور مسلمانوں کا مسلمہ ہے کہ مارأہ المسلمون حسنا فھو حسن جس کو مسلمان حسن سمجھیں وہ حسن ہے لہٰذا اب کسی کو گنجائش انکار

عمارت قبور کے جواز میں نہیں ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان نجدیوں کے اعمال ہر زمانہ کے مسلمانوں کے طریقۂ عمل سے خلاف ہیں۔ جو کچھ میں نے اس مضمون میں لکھا ہے ممکن ہے کہ میں اس کے بعض اجزا سے اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے مخالف ہوں مگر یہ ان مطالب کا التقاط تھا جو مسلمانوں کے کتب تواریخ و احادیث میں مندرج ہیں۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۵ء، جمادی الاول ۱۳۴۴ھ

(۴) ایران کے لئے تازیانۂ عبرت

مشاہد مشرفہ عراق میں فوٹوگراف کی ممانعت اور مشہد

زیر نظر تاثراتی مضمون ایران کی شاہی حکومت سے متعلق جو مغربی سامراجی طاقتوں کے شکنجہ میں پوری طرح جکڑ چکی تھی اور اسلامی، ایمانی اور قومی کردار گنوا تی جا رہی تھی۔ کرۂ زمین پر اس وقت واحد شیعہ فرماں روا کی داخلی و خارجی پالیسیوں پر ایک ایمانی جذبہ سے بھرپور دردمند شیعہ فرد کا جو تحصیل علوم دینی میں مصروف بھی ہو، کیا بروقت تاثر ہوگا، اس مضمون سے واضح ہوگا۔ مضمون کی افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ

مقدس کی پاک سرزمین پر تھیٹر اور سنیما کی عمارت

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

عراق میں ایک زمانہ تھا جب خالص اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور عثمانی ترک اپنے قدیم روایات کے ساتھ سریر آرائے حکومت تھے لیکن زمانہ نے ورق الٹا اور دفتر قدیم کے اجزا خواب پریشان ہو کر منتشر ہو گئے انقلابی تغیرات کے بعد العراق للعراقین کا اصول اگرچہ کامیاب نہ ہوا لیکن حجاز کے شریفی خاندان سے ایک فرد کے برسرِ حکومت بنا دیئے جانے نے ظاہری صورتوں میں عراق کے اندر ایک عربی حکومت کی تشکیل کر دی اور اس کی وجہ سے سطحی نظر سے دیکھنے والے افراد کی بہت حد تک اشک شوئی ہوگئی۔

ترکی حکومت رخصت ہوتے ہی اگرچہ ایک طرف بدامنی کے دور کا خاتمہ ہوا اور راستوں میں پورے طور سے امن و امان قافلوں کی حفاظت کا پورا سامان پیدا ہوا جو آج کل کی منظم دولتوں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن دوسری طرف خارجی انتداب کے برکات سے تمدن جدید کا آغاز ہو گیا اور وہ عرب جو ایک سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اور قناعت و کفایت شعاری لیکن مہمان نوازی میں ضرب المثل، ان کی دولت و ثروت کے حدود عراق سے خارج کرنے کے لئے مختلف قسم کے کھیل تماشہ، تھیٹر، سنیما کے اسباب بہم پہنچا دیئے گئے جس کو دیکھ کر نا تربیت یافتہ اور سادہ لوح عربوں کے حواس باختہ ہو گئے تمام دور اندیشیوں مصلحت بینیوں پر فاتحہ پڑھ کر اجانب کی سیاست کے لئے آلۂ کار بنے اور بہت بلند حوصلگی کے ساتھ اپنی دولت کو اس راہ میں نثار کرنا شروع کر دیا۔

بغداد کا کوئی گلی کوچہ، محلہ راستہ ایسا نہ مل سکتا ہوگا جہاں کوئی جاذب نظر شئے نظر نہ آئے سڑکوں پر جا بجا تھیٹر اور سنیما کی عمارتیں پورے ساز و سامان کے ساتھ دعوت شرکت دینے کے لئے موجود، گلیوں میں عام طور پر شراب کی دوکانیں، اشتہاروں میں بوتل کی تصویریں ابن البنت بنت العنب کی لفظیں۔

دلچسپیوں کے ان اسباب کا مہیا کرانا جس طرح اقتصادی مصالح میں پورا دخل رکھتا تھا اسی کے ساتھ تبلیغی کارگزاریوں میں کامیابی کا راز بھی بہت حد تک مضمر تھا اور مختلف تماشوں کے ذریعہ سے بے خبر اور ناواقف مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر کے اپنے مقاصد کی تحصیل بھی خاص اہمیت رکھتی تھی۔

دارالحکومت یا پایہ تخت کے ان حالات سے قرب و جوار کے مقامات کا متاثر نہ ہونا قطعی ناممکن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشاہد مشرفہ یعنی مقامات متبرکہ آستان ائمہ علیہم السلام میں بھی روحانیت کی جگہ مادیت نے لینا شروع کی اور کم کم اسلامی روایات فنا ہوتے نظر آنے لگے۔ بالخصوص کاظمین کہ جو دارالحکومت بغداد سے صرف دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے ان حالات سے بہت کچھ متاثر ہوا کوئی قہوہ خانہ، بڑی دوکان ایسی نہ تھی جہاں فوٹوگراف رکھا ہوا نہ ہو اور اس کے ارد گرد کثیر جمعیت

مشغول نشاط نظر نہ آئے ، ادعیہ واوراد کی جگہ باجے کی نشاط انگیز صداؤں نے حاصل کی اور شبہائے جمعہ حرم اقدس کے بجائے قہوہ خانہ کی فضا پر نظر آنے لگی ، بے فکری نے اپنا عمل پورے طور پر جمالیا اور عاقبت سے بے خبر افراد دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر شب و روز فوٹوگراف کی شمع جمال کا پروانہ بن گئے۔

تھوڑے عرصہ میں اس کا اثر کربلائے معلیٰ میں بھی پہنچا وہاں کے قہوہ خانہ عام شاہراہیں بھی فوٹوگراف کی دلفریب صداؤں سے خالی نہ رہیں۔

یقیناً یہ حالات ایک اسلامی متبرک بلکہ مطاف خلق مقام کے لئے بالکل نامناسب اور مذہبی روحانیت کے یکسر فنا ہوجانے کا ذریعہ تھے اس لحاظ سے سب کے پہلے کاظمین میں خوش عقیدہ اور پابند مذہب افراد کو اس کا احساس پیدا ہوا اور موثر احتجاج کرتے ہوئے ارباب حکومت کو صورت حال پر توجہ دلائی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلالۃ الملک ملک فیصل کی طرف سے حکم امتناعی صادر ہوا کہ کاظمین اور اس کے حدود میں فوٹوگراف کی سخت ممانعت اور خلاف ورزی پر خاص سزا مقرر کی گئی ، اس کامیابی کو دیکھ کر اہل کربلا کو بھی جوش پیدا ہوا اور مرکز حکومت کو توجہ دلانے پر کربلا کے اطراف میں بھی اس خلاف آداب اسلامیت مظاہرہ کی سختی سے ممانعت ہوگئی اب مشاہد مشرفہ میں کسی قہوہ خانہ یا عمومی مقام پر فوٹوگراف دکھائی دینا ناممکن ہوگیا۔

کون نہیں جانتا کہ عراق کی حکومت کا رسمی مذہب شیعہ نہیں ہے لیکن باوجود اس کے بھی شیعی افراد کے جذبات کا اتنا احترام ضرور قابل شکرگذاری اور مورد و امتنان ہے۔

لیکن جب ہم ان حالات کے مقابلہ میں شیعیان عالم کی واحد سلطنت ایران کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں۔ رہتی وہ سرزمین جو ایک وقت میں شریعت اسلامیہ کا گہوارہ اور احکام ملت جعفریہ کا سرچشمہ تھی ، جہاں سے شیعیت کا علم بلند ہوا اور دنیا کے سامنے حقیقت کا آفتاب طالع ہوا، شیعی دنیا کی تمام امیدیں اسی کے ساتھ وابستہ اور سب تمنائیں اسی ایک سلطنت سے متعلق تھیں، افسوس ہے کہ اسی سرزمین پر مذہبی خصوصیات اس طرح فنا ہو رہے ہیں کہ اگر حالات اسی رفتار پر باقی رہے تو بہت کم عرصہ میں اس وسیع ملک کے شرق و غرب کے اندر اسلامی روحانیت ایک افسانہ ماضی کی حیثیت رکھتی نظر آئے گی۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان اجنبی سلطنت کا حلقہ بگوش ہونے کے بعد سے مغربی تمدن و اخلاق سے پوری طرح متأثر ہوا اور کسی زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے زمین و آسمان بدلا ہوا نظر آئے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عراق و ایران کی خاک میں خارجی اثرات سے متاثر ہونے کا مادہ بدرجہا زائد ہے، اودھ میں اٹھارہ سو ستاون یا اس کے پہلے سے آج تک تہتر سال کی طویل مدت اور دوسرے مقامات پر اس سے زیادہ کا زمانہ گذرا ہے کہ پورے طور پر اجنبی سلطنت برسر اقتدار ہے اور اس طرح کے مختلف حیلوں سے ہندوستان کے اخلاق و عادات کو خراب کرنے کے اسباب بہم پہنچائے جاتے ہیں اس کے برخلاف عراق میں صرف سات آٹھ سال کی قلیل مدت انتداب اور ایران میں صرف مجاورت و اتحاد یا دیکھا دیکھی جن تغیرات کا ظہور ہوا ہے ان کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ان ممالک میں ہندوستان کے مثل ایک طویل مدت اسی حالت پر گذر جائے تو کیا حالت ہوگی؟

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

بقول شخصے ابھی تو ابتدا ہے انجام کی خبر خدا جانے

اعلیٰ حضرت شہنشاہ پہلوی خلد اللہ ملکہٗ کے دور حکومت میں ایران نے جو سیاسی و نظامی محیر العقول ترقی کی اس سے کسی شخص کو انکار کی گنجائش نہیں وہ راستے جو کسی زمانے میں قزاق اور مسلح ڈاکوؤں سے پر تھے جہاں دن دہاڑے قافلے لٹ جایا کرتے تھے جہاں کی زمین کتنے بے گناہوں کے خون سے روزمرہ گلنار بنائی جاتی تھی آج انھیں لق و دق میدانوں میں اتنا امن و امان ہے کہ آدھی رات گذرنے کے بعد ایک بچہ تنہا کوسوں کی مسافت طے کرلے کیا مجال کہ اس کو کسی قسم کا صدمہ پہنچ جائے

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان پانچ چھ سال کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو شواہد وادلہ کی ایک مسلسل فہرست سامنے آجائے گی جو بتلاتی ہے کہ ایران سے مذہبی احساس کا بہت کچھ فقدان ہوتا جارہا ہے۔

سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ مظالم حجاز کا ہے، یہ وہ مصیبت تھی جس نے دوست و دشمن سب ہی کے دل پر اثر کیا، شیعی دنیا میں تو اس سے جو تلاطم برپا ہو وہ کسی اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کا مستحق نہیں لیکن وہابیوں کے علاوہ دیگر فرق اسلام نے بھی اس حادثہ کا پورا اثر لیا، مصر نے صدائے احتجاج بلند کی اور عملی حیثیت سے ابن سعود سے ترک موالات اور مقاطعہ کا کافی مظاہرہ کیا، حضور پرنور نظام حیدرآباد نے بھی سعودی اخبارات کے مقاطعہ کے ساتھ مشاہد مشرفہ، حجاز کی تعمیر کے لئے مؤثر اقدامات کئے اگرچہ ان کو کامیابی نہ ہوئی اور بنے بنائے قبروں کا منہدم کرادینے والا ابن سعود کسی طرح ان کے دوبارہ تعمیر پر رضامند نہ ہوا۔

ممالک خارجہ کی اصطلاح کے موافق ہندوستان غلام ہے اور اس کی زنجیر اسیری طاقت ور اجنبی ہاتھ میں ہے مگر اس غلامانہ زندگی اور سلسلۂ غل وزنجیر کے باوجود بھی وہ تڑپا اور پوری طرح اس نے اپنے مقدور بھر جد وجہد سے کام لیا اس کو حرکت مذبوحی سمجھو یا طائر کا تنگ قفس میں پھڑ پھڑانا لیکن اس نے ثابت کردکھایا کہ اگر میرے بازوؤں میں سکت یا پاؤں میں دم ہوتا تو حجاز اس طرح نجد کے خونخوار وحشیوں کے پنجۂ ظلم میں باقی نہ رہتا اور بنی فاطمہ کے شکستہ مزارات اس طرح شمع وگل کے محتاج نہ رہتے لیکن زمانہ کی انقلابی رفتار اور ہوائے دہر کی مخالفت سے کیا بس چل سکتا ہے کہ دل میں درد ہے مگر ہاتھوں میں سکت نہیں اور بازوؤں میں قوت بھی ہو تو قبضہ میں تلوار نہیں، اسی برس کی محکومیت نے حوصلہ پست کردیے، اور نظام قانونی کے قیود نے زنجیر پا ہو کر تمام مقاصد کے حصول سے مجبور کردیا اب سوائے اس کے کہ آشیاں جلتا رہے اور ہم دیکھتے ہیں چارہ ہی کیا ہے، اتنا ضرور ہے کہ اگر وہ احتجاجی جوش جو پہلے سال تھا قائم رہتا تو کچھ نہ کچھ تاثیر ظاہر کرکے رہتا مگر اس کو بھی ہم قانون فطرت کے بالکل مطابق سمجھتے ہیں کہ جب کسی طرف سے آواز تائید بلند نہ ہوئی اور کسی آزاد اسلامی حکومت نے ہمدردی کا اظہار بھی گناہ سمجھا تو ہمتیں پست ہوگئیں اور ولولے جاتے رہے اور آخر وہ جوش جو ایک مرتبہ پیدا ہوگیا تھا، رفتہ رفتہ فرو ہوگیا، اب سوا اس کے کہ کبھی اخبار کے صفحات پر انجمن آثار متبرکہ حجاز کا نام نظر آجاتا ہے یا اس کی کوئی اپیل شائع ہوجاتی ہے جنۃ البقیع کے متعلق کوئی بے چینی نظر نہیں آتی، کیا اس کے بعد یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہم دنیا میں کسی عزت کو حاصل کرسکتے ہیں؟

شیعی دنیا کی امیدیں ایران سے وابستہ تھیں اور ہونا چاہئے تھیں۔۔۔مگر اس نے اس معاملہ میں کیا کیا؟ کتنے احتجاجی جلسے کئے، دنیا کی متمدن سلطنتوں کو انسانیت وتمدن کے نام پر توجہ دلائی گئی؟ مجلس اقوام میں مظالم حجاز کی شکایت کی گئی؟ ابن سعود کے حلیف یا بقول بعض سرپرست حکومت کو تنبیہ کی گئی، ان چیزوں کا جواب ''کچھ نہیں'' کے علاوہ نہیں ہوسکتا۔

ہم نہیں کہتے کہ ایران اپنی تمام فوجی قوت لے کر ابن سعود کے مقابلہ میں میدان جنگ میں کیوں نہ نکل آیا اور اس نے حجاز کو اپنے قوائے حربیہ کا جولانگاہ کیوں نہ بنا دیا؟ ہم اس کے داخلی مشکلات اور اس کی جنگی طاقت سے واقف ہیں، یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی داخلی کمزوریوں سے فنا کے قریب پہنچ کر دوبارہ اس نے حیات ثانیہ حاصل کی ہے اور اگرچہ امراض زائل ہوگئے مگر طاقت آنے کے لئے ابھی برسوں کی ضرورت ہے اور اگر یہی رفتار ترقی قائم رہے تو ایک عرصہ کے بعد وہ اس قابل ہوسکتا ہے کہ کسی خارجی قوت کے خلاف جارحانہ اقدام کرسکے مگر کیا وہ ان واقعات پر اظہار نفرت واحتجاج سے بھی عاجز تھا، کیا وہ طریقے جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہوائی جہاز اور توپ وتفنگ کے محتاج ہیں اور ایک خود مختار بڑی سلطنت کی جانب سے اسی قسم کے احتجاجات یقینا دنیائے سیاسیات میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے پوری اہمیت رکھتے ہیں۔

ان توقعات کے بالکل برخلاف اخبارات بتلا رہے ہیں کہ حکومت ایران سلطنت ابن سعود کے ساتھ روابط اتحاد و اتفاق قائم کرنے میں منہمک ہے اور اپنے شیعی بلکہ اسلامی جذبات کو بالکل پس پشت ڈال کر ایسی ہستی سے معاہدہ مودت مرتب کرنے پر تیار ہے جس نے اس کی ملی عزت اور قومی خودداری کو پوری طرح پامال کر دیا ہے اور اولاد رسولؐ کے ساتھ اپنی عداوت دیرینہ کو صاف دکھلا دیا ہے۔

سرفراز میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اگر ایرانی اخبارات ترجمانی کے فرض کو ادا کریں جو آج کل خلاف توقع ہے، تو بہت کچھ اہل حل وعقد ایران کے متنبہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد ایران کے اندرونی حالات پر نظر ڈالی جائے تو افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مشہد مقدس کی پاک سرزمین پر جو مطاف خلق اور مزار حضرت ثامن الائمہ حضرت امام رضا سلام اللہ علیہ کی وجہ سے تمام شیعیان عالم کا روحانی مرکز ہے اس میں تھیٹر وسنیما کے لئے خاص عمارت کا تیار کیا جانا اور اس مقدس مقام کو ان منافی روایات اسلامیہ کے مظاہر کا مرکز قرار دینا جس طرح ایران کی مذہبی کمزوری کی دلیل ہے اسی طرح اس کی ملی غیرت داری کے بھی بالکل منافی ہے۔

اقوام عالم نے اپنے متبرک مقامات کے احترام محفوظ رکھنے کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی تک کرنے میں دریغ نہیں کرتے، یورپ جو اس وقت مادیت و دہریت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے وہ بھی اپنے مخصوص مقدس مقامات کی عزت کی نگہداشت کرنا اپنا فرض اولیں سمجھتا ہے لیکن ایک شیعی سلطنت میں اس کے مقدس ترین مآثر کے ساتھ اس بے اعتنائی کا مظاہرہ قابل افسوس ہے۔

ایران کے اس طرز عمل کا مقابلہ اگر عراقی حکومت میں شیعی جذبات کے احترام کے ساتھ کرو تو تعجب کی انتہا نہ رہے گی۔

عراق میں مشاہد کے حدود میں فوٹوگراف کی ممانعت ہو جائے اور مشہد مقدس کی پاک سرزمین پر تھیٹر وسنیما کے لئے خاص طور پر عمارت قائم کی جائے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

علی نقی نقوی عفی عنہ

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ/ اکتوبر ۱۹۲۹ء

جام یہ تلخیِ ایام کا پینا اچھا

خطیب انقلاب مولانا حسن ظفر نقوی، اجتہادی، پاکستان

یہ جو سینہ پہ ہے پانی کا سفینہ اچھا
جس میں دریا بھی سمٹ آئے وہ سینہ اچھا

جھوٹے پانی میں نہ ڈھونڈو کوئی سچا موتی
یہ اگل ہی نہیں سکتا ہے نگینہ اچھا

بے ضمیری ہے اگر عیش جہاں کی قیمت
جام یہ تلخیِ ایام کا پینا اچھا

مفت ہاتھ آئے ہوئے جام جہانگیری سے
ایک مزدور کے ماتھے کا پسینہ اچھا

اب یہ سانسیں بھی ہیں خیرات مری بستی میں
ہم کو اس طرح کے جینے سے نہ جینا اچھا

وصل کے بعد جدائی ہے قیامت سے سوا
دور ساحل سے جو ڈوبے وہ سفینہ اچھا

کون آنکھوں سے چرائے گا مرے خوابوں کو
ملک قارون سے یہ مرا خزینہ اچھا

بھوک افلاس سے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
مل ہی جائے گا کوئی مجھ کو نگینہ اچھا

تاج شاہی میں جڑے لعل وجواہر کو نہ دیکھ
مردِ حر کے لئے کب ہے یہ قرینہ اچھا

❁❁❁